ڈاکٹر عمارہ طارق*

"رضیہ فصیح احمد تلاشِ ذات کی افسانہ نگار اور تانیثی و سماجی شعور"

Abstract: *Razia Fasih Ahmad is known for her versatility in literature and she holds an eminent place among short story writers. She is a proficient short story writer, novelist and dramatist. She has also produced works on children's literature. Razia Fasih Ahmad's novel 'AblaPaa' was awarded the Adamji Award by the Pakistan Writer Guild. Her short stories in English have been broadcasted on the BBC World Service and have been published in the US. Her novel Breaking Links is translated from Urdu to English and is also available in market.*

Razia Fasih's love for story is apparent in her work of short stories. When we conduct a deep review of her short stories, it clearly reflects her proficiency in story writing and structuring the characters in such a proficient way that no laxity is found in creation of her short story.

Razia Fasih Ahmad has very eloquently juxtaposed history with romance. The touch of feminism in her stories has an added appeal. Her short stories cover women's different roles in the society. Her stories do not only portray emotions of happiness, sorrows but also cover almost every aspect of life.

Razia Fasih's consciousness toward feminism has provoked her to enlighten women's individual role in her short stories; hence feminism remained elementary theme in her short stories. This article investigates this aspect of feminism in the fiction of Razia Fasih Ahmed.

افسانہ نگاری کے باب میں رضیہ فصیح احمد کا نام ایک معتبر حوالہ ہے وہ بنیادی طور پر کہانی سے محبت کرنے والی افسانہ نگار ہیں۔ کہانی کی قوت وطاقت اور طلسم وسحر جیسے رموز سے آگہی وہ اوائل عمری میں ہی حاصل کر چکی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچپن میں ہی اس راز کو جان گئی تھیں کہ نانیوں اور دادیوں سے رات کے وقت سنی جانے والی کہانیاں اور قصے قوتِ متخیلہ کے مالک بچوں کے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو انہیں ان دیکھے دیسوں کی سیر اور انجانی شاہراہوں کا راہی بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ طاقت پرواز کئی سربستہ رازوں کو منکشف کرنے اور نئے جہان تخلیق کرنے کی تحریک بنتی ہے اگر ہم جدید تحقیق کا مطالعہ کریں تو یہ محض کتابی بات ہی نہیں رہی بلکہ یہ حقیقت ہے کہ بچپن میں سنی جانے والی کہانیاں اور داستانوی قصے اس نسل کے خون میں طاقت بن کر دوڑتے ہیں اور کسی بھی بڑی قوم کی تخلیق ان خوابوں سے کاشت سے ہوتی ہے جو اس کے بچے دیکھتے ہیں امریکہ کی لائبریری آف کانگرس نے کتابوں کی ایک فہرست

*صدرِ شعبہ اردو، بنک روڈ کیمپس یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

بنائی جنہوں نے ملک کی تشکیل اور اس کے خدوخال متعین کیے۔ سادہ لفظوں میں وہ کتابیں جنہوں نے امریکہ کو امریکہ بنایا۔ اس فہرست میں 88 کتب شامل تھیں اور ان کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور بصیرت افروز فہرست ہے۔ ان کتب میں افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والی کتب بھی شامل ہیں جو کہ بلاشک وشبہ کسی بھی معاشرے کی ذہنی اور جذباتی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کتابوں کی فہرست میں جنہوں نے امریکہ کی تشکیل کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کی ایک کتاب بھی شامل ہے اس کتاب کا نام "گڈ نائٹ مون" آپ اسے "شب بخیر چندا ماما" کہہ لیں یہ کتاب والدین اپنے بچوں کو سوتے ہوئے سناتے ہیں اس قسم کا کام ہماری دادیاں اور نانیاں بھی کیا کرتی تھیں۔(۱)

رضیہ فصیح احمد بھی "چندا ماما" کی کہانیاں سنتے سنتے کہانی کار بن گئیں۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء میں بچوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "آنکھ مچولی" ان کے اپنی خوابوں کی تفسیر ہے جو وہ بچپن میں دیکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ "سیر پاکستان" بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتاب ہے جس پر "ترقی اردو بورڈ" میں پہلا انعام حاصل کیا۔ بچپوں کی عمر کے وہ دن جو وہ گڑیاؤں کے گھر بنانے اور گڈے گڈی کا بیاہ رچانے میں بسر کرتی ہیں رضیہ بانو نے ان دنوں میں تخیل کی کھڑکیوں میں حقیقت کے کئی روزن تلاش کر لیے تھے۔ وہ عمر کے ابتدائی حصے میں ہی زندگی کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید ۱۹۴۷ء کی وہ ہجرت تھی جس نے ذہنی، قلبی اور جذباتی طور پر لوگوں کو نڈھال تو کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ عقل وشعور نے کئی ایسی راہیں بھی تلاش کر لیں جو کسی سنگِ میل کی نشاندہی بھی کرتی تھیں۔

رضیہ اس بارے میں خود لکھتی ہیں:

> "پاکستان آنے کے بعد ان دنوں کی افراتفری، مالی مشکلات، گھر چھوڑنے اور جمنے کی کدوکاوش نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا تھا۔ نفسا نفسی کی اس فضا نے لڑکپن میں دلوں پر کچوکے بھی لگائے۔ اس عمر میں آدمی چونکہ کسی بات کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے یہاں میں نے ذہنی سکون اور فرار کے لیے کتابوں میں پناہ لی اور ۱۹۷۴ء میں نویں کلاس کا امتحان دینے کے بعد پہلا افسانہ لکھا۔"(۲)

رضیہ فصیح احمد قابل افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار اور بچوں کا ادب تخلیق کرنے والی فنکارہ ہیں۔ دوپاٹن کے بیچ، بے سمت مسافر، بارش کا آخری قطرہ اور کالی برف جیسے افسانوی مجموعے تخلیق کرنے والی رضیہ بانو دس سے زائد ناول لکھنے والی ادیبہ ہیں جس کے ناول "آبلہ پا" کو آدم جی ادبی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ کہانی سے محبت کرنے والی اس افسانہ نگار کے افسانوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو افسانے کی بنت کاری میں ہمیں "کہانی" کا فن بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ قطع نظر ان تنقیدی مباحثے جو افسانے کے منفی، ہیئتی اور فنی

حوالوں سے نئے اور منفرد زاویہ نگاہ کو پیش کرتے ہیں ہم افسانے میں "کہانی" کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور وزیر آغا کی اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے رضیہ بانو کی اس خصوصیت کو ان کی افسانہ نگاری کا جوہر قرار دیتے ہیں۔ وزیر آغا کہتے ہیں:

"افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔"(۳)

کہانی کو اجاگر کرنے کے لیے جس کینوس کی ضرورت مسلمہ ہے رضیہ فصیح احمد اپنے افسانوں میں اس کینوس کے انتخاب پر خصوصی توجہ دیتی ہیں۔ وہ کہانی میں واقعہ اور کردار کی پیش کش میں ایسی مہارت کا ثبوت دیتی ہیں کہ افسانے کی تعمیر میں کوئی جھول دکھائی نہیں دیتا۔ امریکہ میں مقیم ہونے کی وجہ سے مغربی و مشرقی تہذیب کے مشاہداتی افسانے ہوں یا کراچی کے ہولناک مسائل کے عکاس افسانے، طبقاتی تضاد اور مسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف احتجاج ہو یا مادیت پرستی کا ماتم، پرانی روایات اور اقدار کی کشمکش دکھائی دے یا اخلاقی بے راہ روی اور عصرِ حاضر کے انسان کے داخل کا نوحہ، عورت کے مثبت اور تعمیری کردار کی تصویر کشی ہو یا اس کے تخریبی کردار کا پردہ چاک کیا ہو رضیہ کے افسانوں میں کہانی اپنے مضبوط رنگ میں جمی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کو موضوعاتی حوالے سے دیکھیں تو کافی تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ در حقیقت رضیہ بانو رومانویت کی انگلی تھامے حقیقت کے در کھولنے میں ایسی مگن ہوئیں کہ ان کی کہانیوں میں موضوعاتی رنگوں کی دھنک بچھتی چلی گئی۔ رومان، حقیقت، خیر و شر کی آویزش، معاشرے اور انسان کے داخلی و خارجی انتشار کا اظہار، عورت کے منفرد روپ اور کنبے کی کہانی میں خوشی و غم کی آمیزش غرض ہر طرح کا موضوع ہمیں ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے، کنبے اور خاندان کا تصور ان کے افسانوں میں کافی مضبوط ہے اور اسی بنیادی نکتے کی وجہ سے ڈاکٹر انوار احمد انہیں کنبہ کہانی لکھنے والی افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

> "رضیہ کی توجہ فرد سے زیادہ کنبے کی جانب ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں آپاؤں اور باجیوں کے ساتھ خالاؤں اور ممانیوں کا ہجوم بھی ملتا ہے متوسط طبقے کا تمدنی اور اخلاقی بکھراؤ رضیہ کے خیال کے مطابق جس المناک صورتِ حال کو پیدا کرتا ہے اس کے بہت سے کردار بڑے کرب کے ساتھ اس کے بارے میں سوچتے دکھائی دیتے ہیں۔"(۴)

کنبے اور خاندان کا ایک بنیادی کردار "عورت" ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے نسائی شعور نے عورت کو ہر روپ میں پرکھا اور جانچا ہے ۔ وہ عورت کی انفرادیت اور اور اہمیت سے بخوبی آگاہ تھیں چنانچہ عورت ان کے افسانوں کا ایک بنیادی موضوع ہے دنیا کی کسی بھی قوم یا زبان کا ادب اٹھا کر دیکھیں عورت ہمیشہ سے ایک موضوع رہی ہے۔ داستان، ناول یا افسانہ کوئی کہانی اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ داستانوں کا زمانہ تھا تو عورت شہزادی، کنیز، دیوی یا پری ہوتی۔ عورت کی فطرت کے مختلف پہلو، کردار کے خدوخال، نفسیاتی کیفیتیں عورت کے زندگی کے بارے میں مخصوص تصورات، معتقدات اور توہمات داستان میں جاری و ساری رہتے وہ امامن ضامن باندھتی دعائیں مانگتی۔ منتیں مانتی

نظر آتی دوسری طرف ایسی عورت کا تصور بھی ملتا ہے جو اپنے اشارہ ابرو سے میدان کے میدان پلٹتی، اپنی مکاری سے بڑے بڑے مسئلے حل کرتی زمین و آسمان کے قلابے ملاتی مردوں کو اپنی جانب راغب کرتی ہے۔ اس کے کردار کے یہی دو پہلو داستان کی جان تھے یعنی وفا شعاری یا مکاری(۵)۔ داستانوی دور سے لے کر جدید ادب تک عورت کے یہی دو کردار جلوہ فرما دکھائی دیتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کے افسانوں میں بھی عورت تعمیری اور تخریبی، مثبت اور منفی دونوں رنگوں میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ ان کے افسانے "ڈائن"، "بہلاوے "اور "جنم جلی" میں ہم عورتوں کے مثبت اور منفی خصائص محسوس کر سکتے ہیں۔

ڈائن افسانے میں رضیہ نے ماں کے روپ میں کینچلی کے اندر زہریلی محبت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر اور اس کی لہروں میں بیٹے کی زندگی کے سفینے کو ڈوبتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرتی اقدار کے بدلنے کے ساتھ عورت کا تصور بھی بدلا ہے مگر ہندوستانی معاشرے اور آج ہمارے ملک کی عورت اپنے جذبہ محبت میں Possession کے فطری جذبے کو خود پر اس قدر حاوی کر لیتی ہے کہ اس کا اصل روپ مسخ ہونے لگتا ہے اس افسانے میں سعید کی ماں اپنے بیٹے سے حد سے بڑھا ہوا جذبہ محبت جو شاید کہ خود غرضی میں بدل گیا تھا سعید کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ سعید ماں کی اس منفی محبت کے آگے نہ صرف اپنی محبت بلکہ اپنی زندگی ہار بیٹھا۔ رضیہ نے در حقیقت عصر حاضر کی خوفزدہ ماں کا عکس پیش کیا ہے جو اولاد کی محبت کو بانٹے جانے کے ڈر سے اسے اپنے ہاتھوں میں محصور کر لینا چاہتی ہے۔ وہ خوشی کے اس محل میں داخل ہو کر تخت نشین رہنا چاہتی ہے جس کا داخلی دروازہ صرف ایک ہو اور اس دروازے میں سے کوئی داخل نہ ہو سکے۔

> "قدرت نے بمشکل تمام اپنے آپ کو ان سے چھڑایا اور ان کی ترس بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی سوچنے لگی، تم اب بھی نہیں سمجھیں ممانی کہ ڈائن میں نہیں تم ہو۔ سعید کو میں نے نہیں تم نے مارا ہے۔ تم نے اور تمہارے بے ڈھنگے پیار نے۔"(۶)

محبت میں شراکت داری کی جلن عورت کو عورت کا دشمن بنا دیتی ہے۔ یہی دشمنی، رقابت کبھی عاشق کو انگاروں پر چلاتی ہے اور کبھی صحراؤں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ رقابت کا یہ جذبہ غالب جیسے خود دار شاعر کو بھی رقیب روسیاہ کے خلاف خدا سے مدد کا طلبگار بنا دیتا ہے۔

بقول غالب:

ے رات کے وقت مئے پیئے ، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے! پر نہ کرے خدا کہ یُوں (۷)

رقابت کا یہی جذبہ کچھ مختلف شکل میں ساس اور بہو کے درمیان کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے۔ "جنم جلی" افسانے میں خدمت گزار بہو بھی ساس کو اپنی دشمن محسوس ہوتی ہے جو اس سے بیٹے کی محبت چھین لے گی۔ بچے کی پیدائش پر ازلی لاپرواہ خاوند وفورِ جذبات میں محبت کے دو بول اپنی بیوی کی جھولی میں ڈالتا ہے تو ماں کا رقیبانہ لہجہ اس کے داخلی محسوسات کی چغلی کھا رہا ہوتا ہے۔

"یکایک ساس آگے بڑھیں محبت کا وہ سوتا جو کچھ دیر پہلے بہو کے لیے دل میں پھوٹا تھا لمحے بھر میں سوکھ گیا۔ غصے میں وہ پھنکاریں۔ "اب تو تجھے پتہ چل گیا اب بھی بیوی کے قدموں میں سر رکھ کر رو رہا ہے اس جنم جلی ماں کی گود میں سر رکھ کر نہ رویا جس نے تجھے جنا تھا"۔ (۸)

کچھ اس قسم کے جذبات ہمیں رضیہ کے افسانے "بہلاوے" میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ رضیہ کے افسانوں میں عورت کا دوسرا روپ آج کی مشینی اور مادی دور کی زبوں حال اور داخلی انتشار کا شکار عورت کا روپ ہے جو اپنی عظمت، وقار اور احترام کو کچلتے ہوئے مادر پدر آزادی کا علم لہراتے، اپنی اور گھر والوں کی ناجائز خواہشات کی تکمیل میں بے راہ روی کی ایسی شاہراہ پر چل رہی ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ جھوٹی چکاچوند، مادیت کی ہوس، ماڈرن ازم اور اسٹیٹس (Status) کا بھوت آج کی عورت کو گھن کی مانند چاٹ رہا ہے۔ اس موضوع کو واضح کرنے والے افسانوں میں "بے سمت مسافر"، "آگ اور پانی" "بھرم" "انکشاف" اور "درماں" جیسے افسانے شامل ہیں۔ "بے سمت مسافر" اس حوالے سے رضیہ کا شاہکار افسانہ ہے جو درحقیقت نسلِ نو کی ترقی نہیں بلکہ تنزلی اور تباہی کا عکاس ہے۔ افسانے کا واحد متکلم کردار سجاد ہے جو کہ شعور کی آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد نامعلوم سی گھٹن، باپ کے جیل جانے پر لوگوں کے طعن و طنز، بہنوں کی نوکریوں پر گردونواح کے افراد کا انگلیاں اٹھانا اور عجیب و غریب نظروں کے تیر اس کے بچپن کے حسین دنوں پر دھند بن کر چھائے رہے۔ جوان ہونے پر اس راز کا کھلنا کہ باپ پیسے کی خاطر اسمگلنگ کرتا تھا، بہنیں آسائش اور آرام کی خاطر پیشہ کرتی تھیں اور ماں اور دادی ان گناہوں میں برابر کی ساجھے دار تھیں۔ یہ سب سجاد برداشت نہ کر سکا اور اپنی بہن کو قتل کر کے خود بھی خودکشی کا ارادہ کر لیتا ہے۔ یہ افسانہ عہدِ حاضر کے مادیت پرست افراد اور نئی نسل کی تباہی کا منہ بولا ثبوت ہے۔ مادیت پرستی نے آج کی عورت کو بے باک اور نڈر بنا دیا ہے۔ وہ اپنے فطری عملی کردار سے گریز کرنے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا خیال مکمل درست نہ ہو مگر کسی حد تک عورت کی اس اخلاقی گراوٹ اور زوال کا ذمہ دار معاشرہ بھی ہے اور عورت کے اس گریز کا خطاکار کہیں نہ کہیں مرد ہی ہے۔ جب مرد اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں تو عورت کا قدم دلدل کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔

"تو آپ ان کو بھی سمجھا دیجئے۔ ان کو بھی بتا دیجئے کہ اگر وہ مجھے پردے کی لولو بنا کر بٹھانا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں مگر وہ مردوں کی طرح باہر نکلیں اور کما کر لائیں۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر کام نہیں چلے گا۔ یہ روز کے حلوے، پراٹھے، یہ بھائی بہنوں کی فیسیں، یہ ٹیم ٹام ایسے تو نہیں بنی ہوئی"۔ (۹)

رضیہ کے افسانوں میں عورت کا ایک وہ روپ بھی بہت کمال ہے جس میں عورت خود اپنی ذات کی بازیافت کر رہی ہے۔ یہاں رضیہ ایسی عورت کی تصویر کشی کر رہی ہے جو نہ مادیت پرستی کی رو میں بہہ کر خود فراموشی کا شکار ہے اور نہ محبت کی گھٹن میں گل سڑ کر اپنے داخل کو متعفن کر رہی ہے بلکہ وہ شعور و آگہی کے در پر کھڑی ہے جہاں تازہ ہوا کا ظہور ہو رہا ہے جہاں وہ دروں بینیکے عمل سے گزر رہی ہے ۔ جہاں خود وہ اپنی عظمت سے آگاہ ہو رہی ہے۔ جہاں اسے اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کا ادراک اور عرفان ہو رہا ہے۔ رضیہ پر ان افسانوں میں فیمینزم اور نسائی شعور کی چھاپ بہت نمایاں محسوس ہو رہی ہے۔ ایسے افسانوں میں جب "پھوپھی کھوئی گئیں"، "دفینہ"، "درماں" اور "کبھی شعلہ کبھی شبنم"، جیسے افسانے شامل ہیں۔

"جب پھوپھی گئیں" میں ایک ایسی عورت کا ذکر ہے جو بظاہر ڈرپوک، بیوقوف اور ذہنی طور پر کمزور ہے مگر در اصل گھر کے افراد اور مرد حضرات نے اس عورت کو اتنا اعتماد ہی نہ بخشا تھا کہ وہ اپنی ذات کا ادراک کر سکتی اسے کھونٹے پر بندھی گائے سمجھا گیا جو اپنا برا بھلا نہیں سوچ سکتی مگر افسانے کے نشیب و فراز کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آج کی عورت ہے جو اپنی بازیافت کرنا جان بن گئی ہے رضیہ اس افسانے میں آج کی عورت کے مثبت پہلوؤں اور اس کی عظمت کو تسلیم کر رہی ہیں۔

" آج عورت نے اپنے آپ کو اس طرح دریافت کر لیا ہے جس طرح پھوپھی نے خود کو اس گم ہو جانے والے دن پا لیا تھا"۔(۱۰)

یہ افسانہ مرزا حامد بیگ کے اس خیال کی تائید کرتا محسوس ہو رہا ہے کہ مشرق و مغرب ہر دو اطراف کے مذہبی مفکرین کا خیال ہے کہ مرد ازل سے صاحب فہم و فراست ہے اور عورت ناقص العقل لیکن حقوق نسواں کی عالمی تحریک نے اب یہ بات منوالی ہے کہ سماجی سطح پر عورت کی بھرپور جدوجہد اسے بالآخر برابری کا درجہ دلوادے گی۔ (۱۱) عورت کی اس جدوجہد کی عملی صورت ان کے افسانے "کبھی شعلہ کبھی شبنم" میں واضح محسوس ہوتی ہے جہاں عورت اپنے حق کی خاطر ڈٹ کر مرد کے ظلم کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے عورت کی نیرنگیوں کو افسانوں میں پیش کر کے خود کو ایک منجھی ہوئی فنکارہ ثابت کیا ہے۔ ایک بڑا ادیب عورت کو اور معاشرے میں عورت کے کردار کو جب پیش کرتا ہے تو اس کی ان گنت پیچیدگیاں اور رنگ صفحہ قرطاس پر اتار سکتا ہے اور ایسا ادیبوں نے کیا بھی ہے، اس کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ عورت کو ایک فرشتہ بنا کر پیش کرے۔ عورت انسان کا ہی روپ ہے اور اس میں تمام نیک و بد انسانی اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ کوئی عورت چالاک و مکار بھی ہو سکتی ہے، پر خلوص اور نیک بھی افسوس اس وقت ہوتا ہے جب عورت کی جانب بعض بڑے اہم ادیبوں کی نگاہوں میں صرف تاریکی سمائے۔ وہ صرف اسکا جسم اور بائیولوجی دیکھ سکیں اور ان میں چھپے انسان تک ان کی نظر کبھی پہنچ ہی نہ پائے اس مردانہ "بائیولوجیکل ازم" اور عورت کے وجود کی محض حیوانی توجیہہ کو بعض فرمانبردار خواتین ادیبوں نے بھی جزو ایمان بنا لیا ہے وہ اس چالاکی کو نہیں سمجھ پاتیں کہ ان کو بعض اعلیٰ خصوصیات تک محدود کر کے ان کی مکمل

انسانیت چھینی جارہی ہے۔(۱۲) مگر رضیہ فصیح احمد نے ژرف نگاہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت کو اس کے منفی اور مثبت اوصاف کے ہمراہ مکمل غیر جانبداری سے پیش کیا ہے اور یہ موضوع ان کی افسانہ نگاری کا بنیادی موضوع کہا جاسکتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کی افسانہ نگاری کا ایک اور اہم موضوع کراچی شہر اور اس کے مسائل کے متعلق ہے۔ روشنی میں چمکتے ہوئے اس شہر کی بدلتی ہوئی روایات واقدار، انتظامی بدنظمی و تنظیمی فقدان، غریب اور متوسط طبقے کی بدحالی، طبقاتی کشمکش اور اخلاقی بے راہ روی کو رضیہ بانو کمال ہنرمندی سے اپنے افسانوں میں واضح کرتی ہیں۔ وہ ان لکھاریوں کی صف میں شمار نہیں ہوتیں جو قلم اور زبان کی طاقت رکھتے ہوئے بھی دست بریدہ اور مہر بہ لب تماشائی بنے رہیں بلکہ ان مسائل اور حقائق پر ان کا قلم رواں اور نگاہ دور رس ہے۔ کراچی کے بگڑتے حالات اور بدنظمی پر ان کے شاہکار افسانے، "آگ اور پانی"، "تیرھواں آدمی"، "انکشاف"، "بڑماں"، "منزلیں کہاں راہیں کدھر" اور بے سمت مسافر لاجواب افسانے ہیں۔

> "پتلی سی سڑک کے ہر موڑ پر ایک مین ہول اسی طرح کھلا پڑا تھا۔۔۔ تعجب ہے کہ ان میں سے کسی بچے کے ڈوب مرنے کی اطلاع اب تک نہیں آئی تھی حالاں کہ بچے تو بچے چلتے پھرتے آدمیوں اور اسکوٹر سواروں کا اس میں گر کر غائب ہو جانا بھی بعید از قیاس نہ تھا۔ کے ڈی اے کے دفتر کے احاطے میں اس نے مین ہول کے ڈھکنوں کے پہاڑ کے پہاڑ سجے دیکھے تھے۔ اے کاش! کوئی ان ڈھکنوں سے مین ہولوں کو ڈھانک دیتا اور زندگی کے ہزار خطرات میں سے ایک خطرہ نکل جاتا"۔(۱۳)

> "یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ ڈرائیو وے ابھی نہیں بنی تھی اور کاریں سمندر کے کنارے تک جایا کرتی تھیں اس وقت تک کلفٹن بیچ اتنا گھٹیا نہ ہوا تھا کہ ناز جیسی لڑکیاں وہاں آتے ہوئے منہ بناتیں"۔(۱۴)

انتظامی بدنظمی کے ساتھ ساتھ طبقاتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں عصرِ حاضر میں پیش آنے والے مسائل مثلاً دولت کی غیر مساوی تقسیم غریب طبقے کی محنت اور غربت میں جھلستے شب و روز، ضروریاتِ زندگی کی قلت اخلاقی بے راہ روی اور آج کے انسان کی مسخ ہوتی شناخت رضیہ کے افسانوں میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں "دوزخ کا ایندھن"، "گھر"، "اُڑان"، "پیلی دراڑ"، "گم نصیب" اور "رکھی مائی" دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان مسائل میں پنپتے معاشرے میں پرورش پاتے ہوئے انسان کا نوحہ کچھ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے۔

> " میں نے اپنے لیے جو زہر تیار کیا تھا وہ سقراط والا زہر نہیں تھا۔ یہ وہ زہر نہیں تھا جس سے پٹ سے آدمی مر جائے۔۔۔ یہ وہ زہر تھا جو مجھے پینا تھا اور پھر۔۔۔ تمام عمر اس کے اثر سے زندہ رہنا تھا۔ یہ جھوٹ مصلحت آمیزی اور زمانہ سازی کا زہر تھا۔ وہ زہر تھا جو دن میں مجھے ہزار بار مارتا۔ مری پور پور، رگ رگ میں سما جاتا تب بھی مجھے موت نہ آتی"۔(۱۵)

رضیہ کا یہ افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے آج کے معاشرے کی بے حسی اور فرد کی بے بسی کا احساس شدت سے محسوس ہوا۔ حقیقتاً آج کا انسان زندگی کی تگ و دو میں اس بری طرح سے پس رہا ہے کہ غلط کو برائی اور برائی کو گناہ کہنے والے لب خاموش ہوتے جا رہے ہیں جبکہ ان کی جگہ جھوٹ ریاکاری اور زمانہ سازی، دلرباو پُر تصنع چہرے اور لہجے دیکھ کر بے ساختہ مجھے احمد ندیم قاسمی کا وہ شعر یاد آ گیا جس میں وہ آج کے دور میں خیر اور حق کے داعی کا زہر پینا مقدر قرار دیتے ہیں۔

؎ نئے انسان سے تعارف جو ہوا تو بولا میں ہوں سقراط مجھے زہر پلایا جائے

آج کا فرد مادیت پرست اور طبقاتی کشمکش کے شکار معاشرے میں اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنے لگا ہے۔ رضیہ جب ایسے موضوع کا بیان اپنے افسانے میں کرتی ہیں تو وہاں رشید امجد کے افسانوں کا دم توڑتا ہوا انسان جھانکتا محسوس ہوتا ہے جو زندگی اور ذمہ داریوں سے اس قدر تھک چکا ہے کہ اسے عورت اور گھر کے دیگر افراد بوجھ محسوس ہوتے ہیں وہ شوہر، بیٹے اور باپ کے روپ میں تمام دن مشقت کے بعد جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو ماں، بیوی، اور بچے اور بہن بھائی اسے گدھوں کی مانند چونچیں نکالے اپنی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ رشتے جو کبھی خوشی و مسرت اور سکوں کا باعث تھے آج کے اس مشینی اور اخلاقی پسماندگی کے دور میں جبر اور مجبوری کے دھاگوں سے بندھے گدھوں کی جون اختیار کر چکے ہیں۔ آج یہ رشتے بے توقیر اور بوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رضیہ فصیح احمد چونکہ عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہونے کے باعث مغربی تہذیب کا بغور مطالعہ کر چکی تھیں چنانچہ اس تہذیب کے کھوکھلے پن تہذیبوں اور نسلوں کا بعد مشاہداتی انداز میں ان کے افسانوں میں واضح دکھائی دیتا ہے۔

ان کے افسانوں میں جہاں عصرِ حاضر کے اخلاقی زوال، بے توقیر رویوں اور مادیت پرست معاشرے کا ماتم ہے وہاں قدیم روایات اور اقدار کی بازگشت ان کے افسانوں "پردہ"، "آشیاں گم کردہ" اور "دوپاٹن کے بیچ" میں واضح دکھائی دیتی ہے۔

> "کبھی بھی جب لوگوں کو جھوٹے نام اور اقتدار کی خاطر لڑتے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا بھی یہی دل چاہتا ہے کہ اٹامک انرجی کمیشن کے انجینئر صاحب کی کرسی چھوڑ کر اسی میدان میں دھول اُڑانے لگوں جسے ابھی آپ نے دیکھا تھا۔ معلوم ہے ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم لوگ misfit ہیں ہم ہر جگہ misfit رہیں گے۔"(۱۶)

یہی المیہ آج کے ہر فرد کا المیہ ہے جو زندگی کے حقیقی حسن اور خوشی کو ختم کر کے مادیت کی دوڑ میں ہر جگہ misfit ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ رضیہ فصیح احمد نے اپنی افسانہ نگاری میں جہاں نسائی شعور کو اُجاگر کیا ان کے شخصی مثبت و منفی خصائص سے پردہ اُٹھایا وہیں پر انہوں نے زندگی کے ساتھ جُڑے ہوئے جملہ خصوصی و عمومی موضوعات کو بھی موضوعِ افسانہ بنایا۔ وہ اپنی خامہ فرسائی کی موشگافیوں میں نہ تو اتنا جانبدار ہوئیں کہ سب اچھا اور بہترین ثابت کرنا چاہا اور نہ ہی منفی جذبات کو اس قدر حاوی ہونے دیا

کہ سب بُرا اور زوال پذیر نظر آئے بلکہ انہوں نے حقیقت کی آنکھ سے تعمیر و تخریب، خیر و شر اور مثبت و منفی معاشرتی رویوں کو جانچا ہے کیونکہ در اصل یہی زندگی اور اُسکا حُسن ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان کے خیال کے مطابق انسانی زندگی کے ارتقا میں ہمیشہ دو تحریکیں سر گرمِ عمل رہی ہیں اور یہ ہمیشہ مد و جزر کی طرح کام کرتی رہی ہیں ان میں ایک کا کام تنظیم ہے اور دوسری کا تخریب، ایک کا کام تحفظ ہے اور دوسری کا انقلاب۔(۱۷) رضیہ فصیح احمد کی کہانی بلاشک وشبہ زندگی کے اسی مد و جزر کی حقیقی داستان ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ غازی صلاح الدین، کتاب اور دنیا بر تنے کا فن مشمولہ جہدِ حق، جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۱۹ء ص ۱۲

۲۔ رضیہ فصیح احمد، مجموعہ رضیہ فصیح احمد، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۵ء، کراچی، ص ۱۲

۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا، "افسانے کا فن" مشمولہ افسانے کے مباحث (مرتب) ایم اے فاروقی، بک ٹائم، کراچی ۲۰۱۷ ص ۱۱

۴۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، کتاب نگر ملتان، ۲۰۱۷ء ص ۲۵۶

۵۔ ڈاکٹر عصمت جمیل، نسائی شعور کی تاریخ، اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۲ء ص ۱۹۶

۶۔ رضیہ فصیح احمد، مجموعہ رضیہ فصیح احمد اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۳ء، ص ۳۳

۷۔ مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور س ن، ص ۳۹۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۹۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۱۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، نسوانی آوازیں، سارنگ پبلشرز۔ س۔ن۔ ص ۸،

12۔ فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی ردِ تشکیل، وعدہ گھر، کراچی ۲۰۰۶ء ص ۱۱

۱۳۔ رضیہ فصیح احمد، مجموعہ رضیہ فصیح احمد ص ۹۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۶۶

۱۷۔ ڈاکٹر محمد عالم خان، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، مجلس ترقی ادب، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۳۵

☆☆☆☆☆